

سیاسیات اسلام کے نظریے

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ

علم کا کام وہ فن ہے جس میں اصول دین کی حمایت کی جائے اور معترض ان پر جو شکوک و شبہات وارد کریں ان کو دفع کیا جائے، لیکن کسی چیز کی حمایت و حفاظت ہر زمانہ میں ایک ہی طور سے نہیں کی جاسکتی، کیونکہ ہر زمانہ کے خیالات یکساں نہیں ہوتے۔ اس تغیر آباد عالم میں کسی چیز کو قرار نہیں، ہر وقت خیالات بدلتے رہتے ہیں، حسن و قبح کا انسانی معیار بدلتا رہتا ہے، چیزوں کی قدر و قیمت کا معیار بدلتا رہتا ہے، لیکن دین جو حق مطلق اور صداقت کا دائمی ہے وہ ناقابل تغیر ہے، توحید، انبیاء، عالم غیب، احکام الہی، آغاز عالم سے ان کے حقائق یکساں ہیں اور یکساں رہیں گے۔ اسی طرح معاملات کی صداقت اور اخلاق کی طہارت کا معیار ہمیشہ سے ایک ہی ہے اور ایک ہی رہے گا، قتل ناحق اور دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر تصرف میں لانا جس کے انواع چوری، ڈاکہ، غصب، خیانت، رشوت وغیرہ ہیں، ہمیشہ ممنوع رہے ہیں اور رہیں گے، جھوٹ کا بُرا اور سچ کا اچھا ہونا نہ کبھی بدلا ہے اور نہ کبھی بدلے گا۔

اوپر کی سطروں کا خلاصہ یہ ہے کہ دین ایک غیر متبدل حقیقت ہے اور انسانی خیالات کا سیلاب ہمیشہ چڑھتا اترتا رہتا ہے۔ ایک ہی چیز جو کبھی اعتراض کا مورد تھی، دوسرے وقت میں مستحسن سمجھی جانے لگتی ہے اور جو کبھی مستحسن تھی، وہ دوسرے وقت میں قابل اعتراض بن جاتی ہے۔

غرض ان غیر متغیر دینی حقائق اور ان تغیر پذیر انسانی خیالات میں ایک کشاکش قائم رہتی ہے۔ علم کا کام یہ ہے کہ اس کشاکش کو دور کرے لیکن اس کشاکش کو دور کرنے کا طریقہ بھی یکساں نہیں رہ سکتا، کیونکہ زمانہ کے خیالات اور ہر کوشش کرنے والے کی دماغی ساخت، ذہنی فعلیت اور طریق فکر یکساں نہیں ہوتا، اس لئے زمانہ کے تغیر اور ہر صاحب فکر کے طریق فکر کے اختلاف سے اس کشاکش اور تصادم کے رفع کرنے کا طریق بھی بدلتا رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ کا علم کلام دوسرے زمانہ کے علم کلام سے الگ رہا ہے، کیونکہ حملوں کی نوعیت کے بدلنے سے ان کی ممانعت کی نوعیت بھی بدلتی ضرور ہے۔

کبھی آسمان کے خرق و التیام، جزء لا تجزئ، استطاعت مع الفعل و قبل الفعل، اور الواحد لایصدر عنہ الا واحد، کے مسائل نفیاً یا اثباتاً علم کلام کے اجزاء تھے، کبھی معجزات کا صدور نبوت کے ثبوت کا معیار تھا، کبھی قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت اس کی حقانیت کا آئینہ تھی، کبھی ان صد اقتوں کے ثبوت کے دوسرے معیار پیدا ہو گئے، چنانچہ کبھی خرق عادت کی کثرت کسی دین کے ثبوت کا ذریعہ تھی اور کبھی خرق عادت کی سرے سے نفی دین کی صداقت کا معیار بنی۔ غرض کبھی دہی یونانی فلسفیانہ خیالات کی عینک سے دین کو دیکھا گیا، کبھی اشراقی صوفیانہ نظری کی سوٹی پر اس کو کسا گیا۔ کبھی منافع دنیاوی اور شواہد عقلی کی ترازو سے ان کو تولایا گیا اور آج یورپ کے افکار و خیالات سے ان کو چانچا جا رہا ہے۔

اسی جدید عہد کے متکلمین کی کوششوں پر ایک نظر ڈالئے جو سید احمد خاں اور مفتی عبدہ کے زمانہ سے آج کے دن تک میدانِ عمل میں آئے تو معلوم ہوگا کہ ہر وقفہ کا علم کلام دوسرے وقفہ سے الگ ہوتا رہا۔ سید صاحب اور مفتی عبدہ کا عہد وہ تھا جب سائنس کی ترقیوں نے مادیت کا زور پیدا کیا اور فطرت اور نیچر اور قواعد طبعی اور نیچرل لاز (قوانین) صداقت کا معیار بن گئے۔ معجزات کی نفی کی گئی، یعنی ان کی تاویل کی گئی، جنت و دوزخ اور عقائد مابعد الطبعی کی باطنی تشریح کی گئی اور اسلام کا نام فطرۃ الہیہ ایسے معنوں میں رکھا گیا جن معنوں میں نیچر کا لفظ بولا جاتا ہے۔

اس کے بعد وہ زمانہ آیا جب فطرت اور نیچر کے بجائے تمدن، تہذیب، طرز سلطنت اور رفاہ عام کے طور و طریق ایک دین کی صداقت اور معیاری ہونے کے دلائل ٹھہرائے گئے، یہ وہی زمانہ ہے جب الفاروق لکھی گئی، الجزیہ لکھا گیا۔ حقوق الذمیین ترتیب پائے، اسلامی شفا خانے اور اسلامی کتب خانے وغیرہ مضامین اشرفیوں سے تولے گئے۔

اب گزشتہ جنگ عظیم نے جب کروٹی تو خیالات کی دنیا میں بھی تزلزل آیا، سیاسیات کے رنگ بدلے اور انسانی حقوق کے نئے نقشے ترتیب پائے، پھر سوشلزم کی کامیاب وحدت نے جب روس کے تحت پر قبضہ کیا تو اقتصادیات کے نئے عقائد لوگوں میں پھیلے اور دینی حقائق کے معیار میں بھی ایک نئی تبدیلی آ گئی۔

صرف پہلے ساٹھ ستر برس کے سیاسی تغیرات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ متکلمین اسلام نے کیا کیا پہلو بدلے، سرسید تک کی تحریروں میں شخصیت پرستی کا زور تھا اور شخصی سلطنت ہی خیر و برکت کا موجب رہی، سید جمال الدین افغانی نے لکھا کہ اسلام کی خیر شخصیت عادلہ میں ہے، اسی پچھلے زمانہ کے ایک بڑے عالم باعمل کی تحریروں میں شخصی بادشاہی کو عین منہجائے اسلام ہونے کی تلقین بکثرت ملتی ہے۔

لیکن ان دماغوں نے جو ابتدائے عہد جدید میں بیدار ہوئے، دستوری حکومت کو منشائے اسلام قرار دیا، اور پھر جمہوریت کا دور آیا، جس میں اسلامی حکومت کو جمہوریہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ ابھی اسی جنگ میں جب جرمنی میں ہٹلر اور اٹلی میں موسولینی کا عروج تھا اور بہ ظاہر یہ نظر آتا تھا کہ فہزم اس معرکہ میں کامیاب ہو کر نکلے گا، طبائع میں میلان پیدا ہو گیا کہ حکومت اسلام کو ڈکٹیٹر شپ اور فہزم کے رنگ میں پیش کیا جائے، اب فہزم اور ڈکٹیٹر شپ کی ناکامی کے

بعد پھر سوشلزم کا زور ابھرنے لگا ہے، اور اب سوشلزم جو وہ ہے جس کا نام اسلام اور سوشلزم کے درمیان توفیق اور تطبیق ہے، بلکہ یہ ہے کہ سوشلزم کے مقابلہ میں اسلامی اصول سیاست و اقتصاد کی برتری ثابت کی جائے۔

محدیثِ نعمت کے طور پر عرض ہے کہ آج تو اس موضوع پر لکھنے والے بہت سے اہل علم ہیں لیکن ہندوستان میں سب سے پہلے راقم الحروف کو اس کی توفیق ملی، غالباً ۱۹۱۰ء میں ”اسلام اور اشتراکیت“ کے عنوان سے ایک مفصل مضمون النودہ میں سپردِ قلم کیا، پھر اسی مضمون کو الہلالِ کلکتہ کی ادارت میں شمولے بعد ۱۹۱۲ء میں ”التحریر فی الاسلام“ کے عنوان سے از سر نو لکھا، جو الہلال کے کئی نمبروں میں شائع ہوا، اس وقت تک اشتراکیت صرف تخیل اور نظریہ تھا، اس نے کوئی عملی صورت اختیار نہیں کی تھی، اس کی عملی صورت تو ۱۹۱۸ء سے ظاہر ہوئی، جب جنگِ عظیم کے خاتمہ کے قریب روس نے بالشویک انقلاب کو کامیاب کیا۔

روسی بالشویکوں کی کامیابی نے بہت سی قوموں کے افکار میں ہيجان پیدا کر دیا اور خصوصیت کے ساتھ محکوم قوموں کے نوجوانوں کے دل و دماغ میں ایسی شورا انگیزی پیدا کر دی ہے کہ سوشلزم ان کا مذہب اور مارکس اور تخیل کی تصانیف ان کا دینی صحیفہ بن گیا ہے اور ان کے اندر اس کی اشاعت اور کامیابی کے لئے وہی جدوجہد اور ایثار و قربانی کی روح پیدا کر دی ہے جو کبھی ”مذہبی مجنوںوں“ کا خاصہ تھا۔

سوشلزم کی تحریک اگر صرف سیاسی و اقتصادی اصلاح طلبی کی چیز ہوتی تو مسلمانوں کو چنداں اس سے اختلاف نہ ہوتا، مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ اس کی تہہ میں لادینی دعوت کام کر رہی ہے، وہ ”قیصر“ اور ”خدا“ دونوں کو ایک ساتھ تخت اور عرش سے اتار کر اور قیصر کے محل اور خدا تعالیٰ کے معبد دونوں کو برابر ڈھانا چاہتی ہے اور بقول اقبال یہ وہ دین ہے جس کا کلمہ لا الہ الا لا ملک ہے، اور اسلام کا کلمہ لا الہ الا اللہ اور لا ملک الا اللہ ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ سوشلزم ایک تخریبی تحریک اور اسلام ایک تعمیری دعوت ہے، لیکن ایک حیثیت سے یہ مسئلہ کلام کے علمی و نظری تنکناے سے نکل کر عملی زندگی کا معاملہ بن گیا ہے۔

یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے، مگر حقیقت ہے کہ اسلامی دعوت کی وسعت جو انسانی زندگی کے ہر گوشہ تک وسیع تھی، مگر وہ گھٹتے گھٹتے صرف چند عقائد اور چند عبادات تک محدود ہو کر رہ گئی، بنی امیہ نے اپنے عمل سے سیاست کو دین سے خارج کر دیا اور عباسیہ نے تہذیب و تمدن و آداب کو بھی دین کی ہمہ گیری سے الگ کر لیا۔ اس کے بعد ایرانی و ترکی و تاتاری سلاطین نے قرآن کے ساتھ آئینِ نوشیروانی اور تورہ چنگیزی کا اضافہ کیا۔ وہ دین تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رکھتے تھے، مگر ان کی سیاست اور خراج و باج کے آئین قیصر و کسریٰ اور چنگیز و ہلاکو کے دستور و قواعد پر مبنی تھے، اس لئے ہماری یہ پچھلی سلطنتیں مسلمانوں کو تو ضرور تھیں مگر اسلام کی نہ تھیں، یعنی ان کے فرمانروا مسلمان تھے، مگر ان کی حکومت کا قانون اسلامی نہ تھا۔ جس طرح آج انگریزی عہد میں بھی محمدؐ لا جاری ہونے سے کوئی سلطنت اسلامی نہیں ہو سکتی تھی، تو کل

صرف نکاح و طلاق و وقف وغیرہ قوانین کے اجراء سے سلطنت اسلامی نہیں ہو سکتی، الایہ کہ اس کے استعمال میں ہم ایک نوع کا مجاز اور تساہل برتتے ہیں۔

یہ کہنا صحیح نہیں کہ مسلمانوں نے اس اسلامی حقیقت کی تبدیلی کو آسانی سے مان لیا، جنگ جمل، جنگ صفین، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حجاج کی لڑائی، معرکہ کربلا، واقعہ حرہ جس میں اہل مدینہ نے بنو امیہ کے خلاف لڑائی لڑی، واقعہ قراء جس میں علمائے عراق نے بنو امیہ کے خلاف معرکہ آرائی کی، واقعہ نفس زکیہ جس میں سادات و علمائے حجاز نے مل کر عباسیہ کے خلاف پر زور بغاوت کی، یہ اور اس کے سوا دوسرے واقعات نے جن میں اصلاح و انقلاب کے علمبرداروں کو کامیابی نہیں ہوئی، خونریزی اور فتنوں کا دروازہ کھول دیا، اس لئے پچھلے متکلمین اور فقہانے یہ اصول بنالیا کہ ہر اصلاح طلبی میں یہ دیکھنا چاہئے کہ فتنوں کے نئے دروازے تو نہیں کھلتے اور حالات بد سے بدتر تو نہیں ہو جاتے۔

ان اصلاح طلبوں اور انقلابیوں کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انقلاب سے پہلے انہوں نے انقلاب کی دعوت کا دور اپنے اوپر نہیں گزارا، اور زمین میں ہل چلانے سے پہلے زمین میں ختم ریزی شروع کر دی، آخر اسی زمانہ میں ابو مسلم خراسانی کی تحریک جس سے عباسیہ حکومت کا آغاز ہوا اور اسماعیلیوں کی تحریک جس سے دولت فاطمیہ پیدا ہوئی اور محمد بن تو مرث کی تحریک جس سے موحدین مراکش کی سلطنت قائم ہوئی، کس طرح دعوت کی راہ سے بڑھی اور پھیلی اور پھولی اور مدتوں قائم رہی۔

زمانہ کے انقلابات نے آج بہت سے امکانات پیدا کر دیئے ہیں، ہر جگہ شخصی سلطنتوں کے تخت خالی ہو گئے، دستوری اور جمہوری اور عوامی سلطنتوں کے آئین پر حکومتیں قائم ہو رہی ہیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ اسلامی اصول سلطنت پر کوئی سلطنت قائم کیوں نہیں ہو سکتی، اس راہ کے جو موانع ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ مسلمان ملکوں کا بڑا حصہ نامسلمانوں کے قبضہ میں ہے، اس لئے ان مسلط قوتوں سے ٹکرائے بغیر اس میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔

۲۔ مسلمان ملکوں میں جو آزاد بھی ہیں وہ نامسلمانوں کی سیاست اور مادی و دینی برتری کے سامنے عاجز و در ماندہ ہیں، یعنی ان کی دینی غلامی میں مبتلا ہیں، وہ انہیں کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور انہیں کے کانوں سے سنتے ہیں، وہ اس کو خیر سمجھتے ہیں جس کو یورپ خیر سمجھتا ہے اور اسی کو شر جانتے ہیں جس کو یورپ شر کہتا ہے۔

۳۔ اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلامی سیاست و حکومت کے آئین و اصول و دستور سے خود مسلمان واقف نہیں، صدیوں کی ظلمت و جہالت نے اسلام کے نور پر پردے ڈال دیئے اور قیصری و کسرا کی و خاقانی دستور و آئین میں اسلامی آئین اس طرح مخفی ہو گیا ہے کہ آج ہم کو اس قیصریت و کسرانیت میں جس کو منانے اسلام آیا تھا، اور اسلام میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

اسلامی حکومت و سیاست کے مؤلفین میں بڑا نام ماضی اور دی شاعری کا ہے، وہاں بھی اصل حقیقت مستور ہے، ایک دوسرے ضابطی عالم کی کتاب بھی چھپ گئی ہے، اس میں بھی حقیقت کا پتہ نہیں، ابن خلدون کے مقدمہ میں بہت کچھ ہے، مگر ماضی کی داستان سرائی نے حال و مستقبل پر پردہ ڈال دیا ہے۔

حق یہ ہے کہ اس باب میں ہندوستان کے مصلح عظیم شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اولیت کا شرف حاصل ہے، ازالۃ الخفا عن تاریخ الخلفاء صرف علم کلام اور اور مناظرہ کی کتاب نہیں ہے، بلکہ اسلامی اصول سیاست و خلافت پر بڑی دقیق اور محققانہ کتاب ہے، لیکن مطالب دوسرے مضامین کے ساتھ متفرق اور بکھرے ہوئے ہیں، مولانا اسماعیل شہید پہلے شخص ہیں جنہوں نے منصب امامت میں اسلامی اور غیر اسلامی اصول و آئین حکومت کو خالص کر کے دیکھا اور مسلمانوں کی حکومتوں اور سلطنتوں کے مدارج اور مراتب مقرر کئے۔

اب جب مسلمانوں کی آنکھیں کھلی ہیں تو نظر آتا ہے کہ یورپ کے پیدا کردہ اقلیت اور اکثریت کے مسئلہ نے ایسی اہمیت پیدا کر لی ہے اور وہ دماغوں پر اس طرح مسلط ہے کہ ان ملکوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، اپنے لئے کسی اصول و آئین کا قیام ان کو سرتاسر محال نظر آتا ہے اور جہاں وہ اکثریت میں ہیں، یورپ کے پیدا کردہ مسئلہ وطنیت نے ان کو از خود فراموش بنا رکھا ہے اور مسلمان کی زندگی ان دنوں باطل نظریوں اور عقیدوں کے نذر ہو رہی ہے اور ہندوستان کی وہ اسلامی تحریک جو ان دنوں سے خود دارانہ علیحدگی چاہ رہی ہے، وہ ابھی تک ایجابی کے بجائے سلبی قوت ہے اور دائمی اور پائیدار زندگی ایجابی و تعمیری قوت کے اندر مضمر ہے۔ بہر حال توقعات قائم ہیں، اصلاح کی کوششیں جاری رہیں تو ممکن ہے کہ دوسروں کی نقالی کے بجائے خود اپنے اسلاف اولین کے کارناموں پر نظر پڑے اور یونانی و رومانی قانون و طریق عدل کی جگہ کتاب و سنت اور قانون اسلام کی اتباع کا شوق پیدا ہو، لیکن اس کے لئے اصلاحی جدوجہد اور اسلامی سیاسیات پر صانع لٹریچر پھیلانے کی ضرورت ہے۔

اس موقع پر ایک واضح گاف بات کہنی ضرور ہے، بعض اہل قلم اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ موجودہ جمہوریت کے اصول و آئین کو ایک ایک کر کے لیں اور اس کا سراغ اسلام میں لگائیں اور اسلامی شریعت کی دلیلوں سے ثابت کریں۔ دوسری طرف یہ کوشش جاری ہے کہ خلافت راشدہ کے انتخابی و انتظامی طریقوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں اور ان کو جامد اصول کی طرح تسلیم کر لیں، جیسا کہ ہمارے متکلمین اور فقہائے سیاست نے خلفائے اربعہ اور امیر معاویہ کے طریقہ انتخاب اور تسلط و استیلا کو ہمیشہ کے لئے دائمی اصول قرار دے لیا ہے، حالانکہ پیش آ جانے والے واقعات کسی مذہب کے ایسے مقررہ اصول نہیں بن سکتے جن میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی جس طرح جہاد فرض ہے اور اس کے آلات جو عہد خلافت میں رائج تھے حملہ اور دفاع کے آلات ان میں محدود نہیں، زمانے کے حالات کے ساتھ ان میں ترقی اور تغیر ممکن ہے۔

انتخاب کے نئے آئین بن سکتے ہیں، قانون سازی اور اختلاف آراء کے مورق پر فیصلہ کے طریقوں میں نئی راہیں

نکالی جاسکتی ہیں اجماع اور قیاس کے علاوہ اصولوں کے مطابق بہت سے نئے اصولوں کی منجائش ہے، مگر ضرورت ہے کہ یہ سب کچھ کتاب وسنت، قضایائے خلفائے راشدین اور مسلمات فقہائے اسلام پر اسی طرح مبنی ہوں جس طرح یورپ کے ہر قانون کی بنیاد رومن لا کے اصولوں پر ہے۔

ہم نے جہاں تک اسلام کے سیاسی اصولوں کا جو کتاب وسنت میں پھیلے ہیں، مطالعہ کیا ہے، یہ چیزیں آتی ہے کہ چند بنیادی اصول ایسے ہیں جو اسلام میں اصول کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے انحراف ممکن ہی نہیں، مثلاً یہ۔

۱..... خلیفہ کے انتخاب میں کہ وہ بہتر سے بہتر ہو، جتنی کاوش ممکن ہو کی جائے، پھر انتخاب کے بعد اس کے احکام کی جو کتاب وسنت اور مصاح لے مسلمان کے خلاف نہ ہوں اس کا حکم واجب الاتباع ہے۔

۲..... امور مجملہ میں جو مخصوص نہ ہوں، اہل حل وعقد سے شوریٰ کیا جائے۔

۳..... بیت المال خلیفہ کی ذاتی ملک نہیں، وہ صرف مصاح لے مسلمان کے لئے ہے۔ اس میں ہر ناجائز تصرف خیانت ہے اور بیت المال اور اس کے اصول وقواعد اسلامی سیاست اقتصاد کے نہایت ہی اہم اصول ہیں۔

۴..... سلطنت کے نظم ونسق میں حد درجہ سادگی اور کم خرچی اختیار کی جائے۔

۵..... عہدہ دار اور اہل منصب میں ادائے فرض کے اندر پوری امانت برتی جائے ان میں سے ہر فرد اپنے کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ سمجھے۔

۶..... عہدہ داران سلطنت کے لئے مقررہ وظیفہ کے علاوہ رعایا سے کسی قسم کا تحفظ نہ رانہ اور اخذ قطعاً جائز ہے۔

۷..... رعایا سے شرعی ٹیکس کے علاوہ دوسرے قسم کے غیر شرعی ٹیکس نہیں لئے جاسکتے۔ فقہ میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔

۸..... حکام پر پورا پورا عدل وانصاف فرض ہے، عدل وانصاف کی راہ میں رشوت، طرفداری، بے انصافی، ظلم گناہ کبیرہ ہے۔

۹..... کاشتکار اور زمیندار کے درمیان اتنا ہی تعلق ہے جتنا ایک مزدور یا اجارہ دار اور مالک کے درمیان ہے، اس کے تفصیلی احکام فقہ کی کتابوں میں ہیں۔

۱۰..... اسلامی حکومت کے اندر ہر مسلمان جو معذور نہ ہو، اس کا سپاہی ہے۔

۱۱..... غیر مسلم رعایا کی حفاظت جان و مال و مذہب کے مسلمان ذمہ دار ہیں، اور ان سے مصالحت کے وقت جو شرطیں قرار پاتی ہوں، ان کو پورا کرنا حکومت پر واجب ہے۔

۱۲..... قانون اور حدود میں ہر ادنیٰ واعلیٰ برابر ہے۔

یہ چند سرسری دفعات ہیں۔ تلاش سے ان میں کچھ اور اضافہ ہو سکتا ہے۔ ان دفعات پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ

اسلامی اصول سیاست ظاہری ہیئت پر مبنی ہیں۔ اس اصلی روح اور اسپرٹ کی بحالی کے ساتھ اگر غیر قوموں سے نظم و نسق کے کچھ قواعد لئے جائیں تو کچھ حرج نہیں، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ خندق میں کھائی کھود کر حصار بنالینے کا طریقہ اہل فارس سے حاصل کیا۔ آلات جنگ میں منجیق کا استعمال اہل یمن سے عہد نبوی ہی میں مسلمانوں نے سیکھا، حضرت عمر کے زمانہ میں حکومت کے دفاتر کا طریق ایرانیوں اور رومیوں سے اخذ کیا۔ زمین کی پیمائش اور بندوبست ایرانی زمینداروں کے ذریعہ سے رائج کیا گیا۔ ان مثلوں سے ظاہر ہے کہ نظم و نسق حکومت کے وہ طریقے جو اسلامی روح سیاست کے منافی نہ ہوں وہ غیر قوموں سے حاصل اور نقل کئے جاسکتے ہیں، وہ آج یورپ کے ان انتظامی اصولوں اور طریقوں کو جو اسلامی اصول کے خلاف نہ ہوں قبول کیا جاسکتا ہے، ضرورت ہے کہ ہمارے نوجوان علماء جن کی طبیعتوں میں امنگ ہے، وہ ان مسائل پر تحقیقی مضامین لکھیں اور مسلمانوں کی نئی سیاسی زندگی کے لئے نئی راہیں کھولیں۔

☆.....☆.....☆

تجزیہ کے مطابق سال 2001 میں امریکہ کے ”ٹوئن ٹاور“ پر دہشت گردی کی واردات تک برطانیہ میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد ساٹھ ہزار سے زیادہ نہیں تھی جو اس کے بعد سے ایک لاکھ سے بھی تجاوز کر چکی ہے، اس تعداد میں مزید اضافے کی توقع کی جا رہی ہے۔ برطانیہ کے انٹرفیچہ تنک ٹینک نے ”فیچہ انفیر“ کے عنوان سے جو تجزیہ شائع کیا ہے اس کے مطابق اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں اضافے کی ایک بڑی وجہ ”مغربی میڈیا“ کی اسلام دشمن مہم کے خلاف رد عمل بھی ہے جو اسلام اور مسلمانوں کو بنیاد پرستی، دہشت گردی اور انتہا پسندی کے خوف اور اندیشوں کی عینک سے دیکھ رہا ہے۔ فیچہ انفیر کے ڈاکٹر فیاض مغل کا کہنا ہے کہ یہ محض اندازہ ہی نہیں، برطانیہ یعنی انگلستان، ویلز اور اسکاٹ لینڈ کی مسجدوں سے حاصل ہونے والے اعداد و شمار اور مذہب اسلام قبول کرنے والی عورتوں اور مردوں سے ہونے والے انٹرویوز کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ مغربی میڈیا کے زہر تلے تشہیری حملے کی زد میں آنے مذہب، اسلام کو سب سے زیادہ توجہ اور احترام کا مقام مل رہا ہے۔ اس کا ریڈیٹ بہت حد تک مغربی میڈیا کو بھی جاتا ہے کہ انہوں نے انگلستان کے لوگوں کو اسلام کے اندر جھانکنے اور لوگوں کو اسلام کے خلاف زہر پٹی مہم کی وجہ جاننے پر اکسایا ہے۔..... لائق توجہ اور غور طلب بات یہ ہے کہ برطانیہ کے شہری علاقوں میں جہاں فی دی نیٹ ورکس، ریڈیو چینلز اور اخبارات کی بھرمار ہے، اسلام کو بطور مذہب قبول کرنے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

بائیں بازو کے دانشوروں کا کہنا ہے کہ خواتین کو کسی بھی معاشرے کی تباہی و بربادی کا سب سے پہلے پتہ چلتا ہے۔ برطانوی معاشرے سے سرمایہ داری نظام اور بازاری معیشت کی بربادی اور تباہی کے تحت ہی برطانیہ کی خواتین اسلام کو بطور مذہب قبول کر رہی ہیں۔ اسلام قبول کرنے والوں کا تناسب 63 فیصد ہے۔ ان کی اوسط عمر ساڑھے ستائیس سال بیان کی جاتی ہے جو شعور کی عمر ہے، ان کی اکثریت ”نفتاب“ اوڑھنا پسند نہیں کرتی مگر حجاب استعمال کر کے اپنی الگ شناخت بنانے میں دل چسپی رکھتی ہیں۔

122 انگریز خواتین سے پوچھا گیا کہ انہوں نے اسلام کیوں قبول کیا؟ اکثریت کا جواب تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ مادہ پرستی کے خلاف ہیں۔ مذہب اسلام قبول کرنے والے مردوں کی اکثریت کے خیال میں زندگی کا کوئی اعلیٰ مقصد ہونا چاہیے، اسلام دنیا کا جدید ترین مذہب ہے اور اس میں سماجی و اور معاشرتی انصاف پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ ☆☆☆